ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3 2024

لیاقت علی کے افسانوں میں مقامی معاشرت کا عکس

REFLECTION OF LOCAL CULTURE IN THE SHORT STORIES OF LIAQAT ALI

1. Bakhtawar Saleem
M.Phil, Department of Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan
Email: bakhtawarsaleem99@gmail.com
2. Muhammad Ajmal Khan
M.Phil Scholar, Department of Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan
Email: ajmalkhan.ise.pk@gmail.com
3. Dr.Munawar Amin
Assistant Professor, Department of Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan
Email: drmunawaramin143@gmail.com

ABSTRACT:
Liaqat Ali is one of the emerging fiction writers of todays. He was born on September 13,1972 in Multan and grew up here. He studied in Multan and today he is serving as a Urdu professor in Islamia University Bahawalpur. Liaqat Ali is a Short Story writer who interprets locality. So far, two fictional collections have been published. In which, we can see the dynamic images of the culture and society of Multan. He has interpreted the life, problems and difficulties of a local man in his stories. He has made local life of Multan the subject of his stories and also created characters which is connected to his land. How much the stories of Liaqat Ali are under the impact and influence of localism? It is being analysis and explored in this article.

KEYWORDS: Emerging, Locality, Dynamic, Culture, Interpret, Influence

کلیدی الفاظ:
ابھرتاہوا، مقامیت، متحرک، ثقافت، تشریح، زیراثر

لیاقت علی عصر حاضر کا ایک ابھرتاہوا افسانہ نگار ہے اور ملتان کے افسانوی ادب سے تعلق رکھنے والے ان ادیبوں میں شامل ہے جو قصہ گوئی کے فن سے نہایت باریک بینی سے واقف ہیں۔ لیاقت علی کے اباؤاجداد قیام پاکستان سے پہلے ہی ملتان کی قدیم کالونی شمس آباد میں آباد تھے۔ جہاں ۱۳ ستمبر ۱۹۷۲ء کو غلام محمد کے ہاں لیاقت علی نے جنم لیا۔ لیاقت علی نے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم بھی ملتان ہی سے حاصل کی۔ یونیورسٹی کی سطح پہ ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈاکٹر قاضی عبدالرحمن عابد اور ڈاکٹر عقیلہ جاوید جیسے اساتذہ سے اردو ادب پڑھا۔ ۱۹۹۸ء میں اردو کے اساتذہ کے طور پر عملی زندگی کا آغاز بھی ملتان ہی سے کیا۔ ۲۰۰۲ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے لیکچرار منتخب ہوئے اور مظفر گڑھ کے مضافاتی علاقے رنگ پور میں موجود ڈگری کالج میں تعینات ہوئے۔ ۲۰۰۵ء میں لیاقت علی کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ اُردو واقبالیات میں بطور اردو لیکچرار منتخب کیا گیا۔ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد لیاقت علی کو ۲۰۱۳ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ نومبر ۲۰۱۹ء میں لیاقت علی کو ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے ہی ترقی ملی اور اب بطور پروفیسر جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

لیاقت علی کو ابتداء ہی سے افسانوی نثر میں دلچسپی رہی تبھی ابتداء میں ہی افسانے کے ایک باذوق قاری، استاد اور پھر محقق کے طور پر سامنے آئے۔ میٹرک میں مہر گل محمد جیسے استاد نے آپ کے اندر اردو ادب کی چنگاری جلائی اور پھر علمی شوق وادبی ذوق کی آبیاری بھی کی۔ لیاقت علی نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا اور پہلا افسانہ "شہر کی سب سے پرانی کہانی" لکھا جو ۱۹۹۹ء میں ملتان کے پبلک سکول کے میگزین میں شائع ہوا۔ اس کے بعد لیاقت علی سہ ماہی کتابی سلسلہ "انگارے" میں افسانے لکھتے رہے۔ انگارے کے علاوہ لیاقت علی کے افسانے ادبیات تناظر، پیلھوں، مٹھن، سطور اور نقاط جیسے ادبی رسالوں میں مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں بھی لیاقت علی کے افسانے موجود ہیں۔ اردو ادب میں افسانہ نگاری کی ترویج کے لیے آن لائن دو بڑے پلیٹ فارم "اردو افسانہ فورم" اور "عالمی افسانہ فورم" ہیں۔

ان دونوں پر لیاقت علی کے افسانے تواتر سے آن لائن کیے جاتے رہے ہیں۔اب تک لیاقت علی نے تقریباً ۵۰ سے زائد افسانے اور ۲۰ افسانچے تحریر کیے ہیں۔ تمام افسانے دو افسانوی مجموعوں کی صورت میں منظر عام پہ آچکے ہیں۔

پہلا مجموعہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں "۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔دوسرا مجموعہ "جھوٹے آدمی کے اعترافات "۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔پہلے مجموعے "پلیٹ فارم "کا نیا ایڈیشن ترامیم واضافے کے ساتھ ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

مقامی معاشرت کی بات کی جائے تو معاشرت کے معنی رہن سہن کے ہیں۔جس طرح کسی علاقے کا رہن سہن، طرزِ زندگی، رسوم و رواج، تہذیب و ثقافت اُس علاقے کی معاشرت کا بیاں ہیں بالکل اسی طرح کسی مقام یا عہد کی امتیازی خصوصیات، خاص باتیں یا تفصیلات جن سے اس جگہ کے بارے میں سمجھنے میں مدد مل سکے، مقامیت یا علاقیت کہلاتی ہے۔دوسرے لفظوں میں کسی خاص خطے کے پیدائشی چاہے وہ پودے ہوں، پرندے ہوں، جانور ہوں یا لوگ، مقامی کہلاتے ہیں۔مقامیت کے لفظی معنی ہیں قائم مقام ہونا۔اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مقامیت در حقیقت مقام پیدائش اور زندگی کا نام ہے۔اس کو فطرت کے ساتھ انسانی مراقبے کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔معاشرت میں یہ ضروری نہیں کہ اس میں بسنے والے افراد کسی خاص قوم یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔مگر مختلف قومیں اور مذاہب ایک مقام پہ متحد ہو کر اپنی ایک مقامی معاشرت ضرور قائم کر لیتے ہیں۔مقامی معاشرہ کسی مقام یا علاقے سے منسوب ہوتا ہے۔مقامی معاشرت در حقیقت قائم مقام لوگوں کی زندگی اور اس زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام معاشرتی موضوعات پر مشتمل ہوتی ہے۔

ادب میں مقامیت کی بات کی جائے تو کسی بھی خطے میں ادب کی روایت اور مستحکم بنیادوں کی کونپلیں وسعت مطالعہ سے پھوٹتی ہیں۔اور اہل ادب کتابی دنیا میں چاہے کسی بھی کتاب کا مطالعہ کریں، چاہے وہ "دیوانِ حافظ شیرازی" ہو یا "پیرس کا کرب"، میرؔ و مصحفیؔ کی شاعری کے طلسم میں کھو جائیں یا "عہد نامہ قدیم" میں قدیم مقامی زبانوں کا مطالعہ کریں، قرآن مجید کو پڑھ کر اس کا اسلوب سمجھنے کی سعی کریں یا پھر "رگ وید اور پران" کا مطالعہ کر کے دنیا جہان کی اساطیر کو سمجھنے کی کوشش کریں مگر جس وقت ادب تخلیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو شعوری یا لاشعوری طور پہ مقامی زبان، اپنی ساخت اور اپنی مقامیت کا اثر لیے اپنے ہی لوگوں کے بیچ رہ کر بات کرتے ہیں۔اپنے ہی لوگوں کے درد کو محسوس کر کے، اپنی دھرتی پہ کیے گئے ظلم واستحصال کو قلم بند کرتے ہیں۔مقامیت کا ایسا ہی اثر ملتان کے افسانوی ادب میں ہمیں لیاقت علی کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔لیاقت علی نے افسانہ لکھنے کی مروجہ روایت اور تنقیدی فضا کے ساتھ ساتھ جدید فلسفیانہ اور علمی نظریات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہانیاں لکھی ہیں۔پہلے مجموعے میں لیاقت علی کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا بہترین امتزاج دیکھنے کا ملتا ہے۔جس میں وسعت مطالعہ، عمیق مشاہدہ اور شدت جذبات بنیادی عناصرِ افسانہ ہیں۔اس کے علاوہ عصر حاضر کے انسان کے داخلی اور خارجی زندگی کے رنگ اس مجموعے میں جابجا بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔اس کے ساتھ اس خطے کی سڑکیں، گلیاں، ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم، یونیورسٹی ہاسٹل میں بکھری مقامی زندگی کو کہانیوں کا روپ دیا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے مشاہداتی قوت سے کہانیاں اس طرح کھوج کر تحریر کی ہیں کہ افسانے کی کرداروں اور کہانیوں سے قاری کو مانوسیت محسوس ہوتی ہے۔اس بات کا اظہار خود بھی کیا ہے:

> ''میری کہانی کے پاؤں اِسی مٹی میں پیوست ہیں۔میرے یہ کردار اسی سماج کے گلی کوچوں میں بستے ہیں۔۔۔میری کہانیاں میرے مشاہدات، تجربات اور مطالعے کے امتزاج سے بُنی گئی ہیں۔میرے نزدیک انسان اور اس کی توقیر سب سے معتبر حوالے ہیں۔میں بنیادی طور پر ایک امن پسند آدمی ہوں اور میری امن پسندی بسا اوقات بزدلی کی حدود کو چھونے لگتی ہے۔میں جنگوں، ہتھیاروں اور فاتحین سے کبھی ذہنی مطابقت پیدا نہیں کر سکا۔میں جیتنے والوں کی سرشاری سے زیادہ ہارنے والوں کی بے بسی متوجہ کرتی ہے۔میں کسی نسلی تفاخر یا معاشی آسودگی کو انسانی معراج نہیں گردانتا۔مجھے سبزہ، بارش، پہاڑ، موسیقی، خوشبو، چائے اور مقدور بھر رزق اچھا لگتا ہے۔میں نفرت نہیں کر سکتا؛ یہاں تک کے دشمن سے بھی نہیں۔اور یہی میرے افسانے ہیں۔''[۱]

لیاقت علی ایک ایسا کہانی کار ہے جس نے اپنی دھرتی، مٹی سے جُڑی مقامی زندگی کے کردار تخلیق کیے ہیں۔ان دیکھی دنیاؤں یا پھر رومان کی کہر میں لپٹی کسی افلاطونی محبت کی کہانیاں نہیں لکھیں بلکہ اپنے معاشرے میں موجود مقامی افراد کی زندگی کی الجھنوں کو موضوع بنایا ہے اور اعلیٰ طبقے سے لے کر ہر طبقے کے افراد کو کہانیوں میں سمویا ہے۔جدیدیت کے زیر اثر مقامی زندگی کی مصروفیات، رویے اور مسائل کو قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔زندگی کی پیچیدگیاں اور مشکلات کو سادہ ادائیگی میں ڈھال کر قلمبند کیا ہے۔بقول محمد حمید شاید:

> ”اگر میں یہ کہوں کہ لیاقت علی نے روایتی کہانیاں نہیں لکھیں، ایسے خواب لکھے ہیں جو حقیقت ہو جاتے ہیں اور ایسی حقیقتیں لکھی ہیں جو محض کسی وقوعے تک محدود نہیں رہتی، نمو پا کر زندگی جتنی بڑی حقیقت ہو جاتی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان افسانوں کی ایک اور خوبی پیچیدہ تر موضوعات اور مشکل کرداروں کو زبان کی سادگی سے بہ سہولت کہانی کے اندر رواں کر لینا ہے۔ کہہ لینے دیجئے کہ "جھوٹے آدمی کے اعترافات" ایسے افسانوں کا مجموعہ ہے جو سچے تخلیق کار کے خلوص بھرے قلم کی عطا ہو کر بہت اہم ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ لیاقت علی کے پہلے مجموعے کی طرح یہ مجموعہ بھی فکشن کی دنیا میں بہت توجہ سے دیکھا جائے گا۔“[۲]

عصرِ حاضر کے کہانی کار کے طور پر لیاقت علی نے ملتان کی تہذیب و معاشرت اور اس شہر کے مرقعے اپنے افسانوں میں بڑے واضح انداز میں سموئے ہیں۔ مقامی زندگی کی متحرک تصاویر کی بڑی تعداد لیاقت علی کے افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہے بالخصوص ملتان کے مختلف مقامات، سڑکیں اور مشہور جگہیں، گلیاں، کالونیاں وغیرہ اس طرح سے کہانیوں میں پروئی گئی ہیں کہ کہانیوں میں انھی جگہوں پر وقوع پذیر ہونے والے حقیقی واقعات کا گماں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ مقامی زندگی کے روزمرہ معمولات، رویے، اقدار، رسوم و رواج، مسائل و برائیاں اور بالخصوص مقامی معاشرت میں رچے بسے معاشی و طبقاتی استحصال کو اپنی کہانیوں میں موضوع بنایا ہے۔ ہمیں لیاقت علی کے ہاں اس خطے کی مقامی تاریخ اور قدیم معاشرت کا بیان بہت کم دکھائی دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ لیاقت علی ترقی پسند اور جدید افسانوی ادب کے تخلیق کار ہیں۔ آپ کے دوسرے مجموعے کا افسانہ "شناخت" ملتان کے قدیم مقامی لوگوں کی شناخت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ کہانی ملتان کے ان مقامی لوگوں کی ترجمانی کرتی دکھائی دیتی ہے جو اس خطے کے ابتدائی واسی تھے جنہیں آریہ قوم نے حملہ کر کے یہاں سے مار بھگایا تھا۔ وہ مقامی لوگ مؤرخین کے مطابق جنوبی ہند کی جانب پناہ لینے کے لیے جنگلوں اور پہاڑوں میں چلے گئے۔ اور پھر کئی عرصے بعد اپنے وطن واپس لوٹنے پر وہ اپنی سماجی شناخت کھو چکے تھے۔ نئے قائم ہونے والے معاشرے نے انہیں قبول نہ کیا۔ برتری کے اعلیٰ معیار قائم کر دیئے گئے کہ مقامی لوگوں کو نہ صرف مرتبے بلکہ شکل و صورت سے بھی حقیر گردانا گیا۔ افسانہ "شناخت" میں ایک مقامی آدمی کے روپ میں متکلم موجود ہے جس کا نام ماں باپ نے شکل و صورت کے متضاد سکندر بخت رکھا۔ جو معاشرے کے طنز و مزاح سے بچنے کے لیے اپنی مقامی پہچان و شناخت کو مخفی رکھنا چاہتا ہے۔ جسے معاشرہ اپنی شکل و صورت اور نین نقش کی وجہ سے مقامی نہیں خیال کرتا۔ جبکہ ماں باپ کا شجرہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ سکندر بخت کا خاندان پچھلی سات پشتوں سے اس خطے کا مقامی ہے۔

> ”ایک شجرہ ماں کے پاس بھی ہے جو بتاتا ہے کہ وہ خالصتاً اس دھرتی کی بیٹی ہیں۔ پچھلی سات پشتیں تو کم از کم یہی تصدیق کرتی ہیں۔ ۔۔ تاہم میرے ساتھ فطرت نے عجب مذاق کیا۔ میرا نحیف بدن، گھنگریالے بال اور سیاہ رنگت میرے اندر باپ کے شاہد ہیں تو چپٹے نقوش، پست قد اور اندر کو دھنسی بے جان آنکھیں میری ماں کی نشانیاں۔۔۔ ان نشانیوں کی دین ہے کہ میری بستی نے بخت کے سکندر کو کبھی قبول نہیں کیا۔ کالی، کالے، پستے اور حبشی ایسے نام وقتاً فوقتاً میرے لیے تجویز ہوتے رہے اور میرا باپ کمیٹی کے اُس سرٹیفکیٹ سے مجھے بہلاتا رہا جس پر جلی حروف میں سکندر بخت درج تھا۔“[۳]

اس افسانے کا اختتام کچھ اس طرح سے ہے کہ مقامی آدمی نے تنگ آ کر معاشرے کی پسند اور معیار کے مطابق اپنے نقوش اور چہرے کے خدوخال بدلے مگر معاشرے کے ساتھ گھر والوں نے بھی اسے پہچاننے سے انکار کر دیا وہ لاکھ قسمیں کھا کر اپنی پہچان اور شناخت کا یقین دلاتا رہا مگر کسی نے اُسے موٹے بھدے نقوش والا سکندر بخت نہ سمجھا۔ اس سے ہم یہ مراد لے سکتے ہیں کہ مقامی لوگوں نے نئے معاشرے کے مطابق خود کو اس قدر ڈھال لیا کہ اپنی پہچان کھو دی۔

ذیل میں مقامی معاشرت کے کچھ پہلوؤں جن میں طرزِ زندگی، رویے، معاشرتی اقدار کی تبدیلی، مقامی زندگی پہ سیاسی عمل دخل، معاشرے میں پھیلتی برائیاں اور طبقات کے لحاظ سے انسانی استحصال کو لیاقت علی کی افسانہ نگاری کے حوالے سے بیان کیا جارہا ہے۔

لیاقت علی نے اپنے زمانے کی مقامی معاشرت، یونیورسٹی کا ماحول اور پڑھے لکھے طبقات کی زندگی کے گوشوں کو عکس بند کرنے کے ساتھ کہیں کہیں دیہاتی زندگی کو بھی عکس بند کیا ہے۔ افسانہ "قرض" اور افسانہ "کرم داد بھی" کے ابتداء میں دیہاتی طرزِ زندگی کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ ان دونوں افسانوں کا موضوع اور کہانی دیہاتی معاشرت سے ہٹ کر ہے مگر لاشعوری طور پہ لیاقت علی کے ہاں دیہات کی مقامی معاشرت سے وابستگی ان دونوں کہانیوں میں در آئی ہے۔ افسانہ "قرض" میں گاؤں میں لوگوں کو مہیا محدود وسائل اور سہولیات کا تذکرہ ملتا ہے۔ افسانے میں متکلم اپنے والد اور بیوی بچوں کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں جا رہا ہے۔ اپنے بچپن کے زمانے کو یاد کرتا ہے کہ اس کے زمانے میں گاؤں میں کس قدر وسائل کا فقدان رہا مگر انھی محدود وسائل میں گاؤں کے دیہاتی لوگ زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شہر سے

رابطے کے لیے گاؤں والوں کو ایک یا دو گاڑیاں میسر ہوتی ہیں اور گاؤں سے رابطے کے لیے شہر سے بڑی بڑی گاڑیاں آتی ہیں جنھیں دیکھ کر گاؤں کے سادہ مزاج لوگ نہایت ادب سے سڑک کنارے کھڑے ہو جاتے ہیں اور گماں کرتے ہیں کہ اس بڑی گاڑی میں ضرور وڈیروں اور جاگیرداروں کے بچے شہر سے گاؤں آئے ہوں گے یہ سوچ ان کے ہاتھوں کو بے اختیار ماتھے تک لے جاتی اور اس وقت تک سلام و آداب کی رسم ادا ہوتی رہتی جب تک گاڑی مٹی اُڑاتی نظروں سے اوجھل نہ ہوتی۔ گاؤں کے لوگوں کی اس سادگی کو یاد کرتے متکلم ذرائع آمد و رفت کے حوالے سے لکھتا ہے:

''اس زمانے میں شہر سے گاؤں یا گاؤں سے شہر جانے کے لئے اُس اکلوتی بس کا انتظار کرنا پڑتا تھا جو چوہدریوں کے منشی نے خاص طور پر اس روٹ پر چلائی تھی۔ یہ بس ہر صبح گاؤں سے روانہ ہوتی اور پھر راستے میں آنے والے چھوٹے بڑے دیہاتوں سے گزرتی چالیس کوس دور شہر تک پہنچنے میں کئی کئی گھنٹے صرف کر دیتی۔ اور پھر وہی بس شام سورج غروب ہوتے ہی شہد کی مکھیوں کے چھتے ایسا لوگوں کا ہجوم لئے واپس گاؤں آن پہنچی۔''[۴]

لیاقت علی کے افسانے اس خطے کے مختلف طبقات کی زندگی کے عکاس ہیں مگر زیادہ تر پڑھے لکھے طبقے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہری زندگی کی عکس بندی زیادہ کی گئی ہے۔ اس خطے کی معاشرت میں شہری زندگی مختلف طبقات کے ساتھ مختلف اقسام میں بٹی ہوئی ہے۔ کہیں مشترکہ خاندانی نظام قائم ہے تو کہیں گھر کے بزرگ آبائی گاؤں میں مقیم ہیں اور جوان اولاد نے شہر میں الگ گھر بسائے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کہیں میاں بیوی دونوں ورکنگ سے منسلک ہو کر زندگی گزار رہے ہیں۔ عصرِ حاضر میں ملتان کی معاشرت میں خواتین کو مرد کے شانہ بشانہ ہر شعبے میں کام کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ افسانہ "لانگ ویک اینڈ" میں عملی زندگی میں مصروف میاں بیوی کے معمولاتِ زندگی کو عکس بند کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار "احمد مسعود" ہے۔ اس کہانی کا موضوع بلاشبہ جنسی تسکین ہے مگر اس میں مقامی معاشرت سے تعلق رکھنے والے متوسط طبقے کے چھٹی پہ معمولاتِ زندگی کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہے:

''وہ اور حمیرا دونوں ورکنگ پارٹنر تھے اور مہینے بھر کی مصروفیت کے بعد مہینے کا پہلا لانگ ویک اینڈ انہیں ملتا تھا جب ہفتہ اور اتوار کی دو چھٹیوں کو وہ ایک طے شدہ شیڈول کے مطابق گزارتے۔ وہ جمعہ کی شام گھر سے باہر نکلتے، ہوٹلنگ کرتے، گھومتے پھرتے اور اُس رات دیر تک جاگتے رہتے۔ پھر اگلے روز دوپہر تقریباً بارہ بجے سو کر اُٹھتے۔۔۔ ایک بجے کے قریب ناشتہ ہوتا اور ناشتے کے بعد حسب روایت وہ علی حمیرا اور اپنی بوڑھی آپا کو سسرال چھوڑ آتا جہاں حمیرا اپنی ماں اور علی نانو کے پاس مہینے کے بعد ایک رات کے لئے بے حد خوش رہتے۔ وہ بھی یہ شام دوستوں کے ساتھ گھومتے پھرتے رات دیر تک آوارہ گردی کرتے گزارتا اور رات دیر سے گھر آتا اور پھر اتوار کے روز بارہ بجے کے بعد اُٹھتا۔ نہاتے تیار ہوتے سہ پہر ہو جاتی اور پھر جا کر حمیرا اور علی دونوں کو گھر لے آتا۔''[۵]

اس افسانے کی کہانی عصرِ حاضر کے ملتان کے مختلف علاقوں میں گھومتی ہے۔ ملتان کی مختلف جگہوں پر کہانی کی منظر کشی کی گئی ہے جیسے سبزہ زار کالونی، بوسن روڈ، کشمیر چوک، گھنٹہ گھر، ایم ڈی چوک، شاہ رکن عالم دربار، ملتان کینٹ اور قلعہ ملتان کا ذکر کیا گیا ہے۔

مقامی معاشرت میں رہن سہن کے حوالے سے مشترکہ خاندانی نظام کو بھی موضوع بنایا ہے۔ قدیم معاشرت میں مشترکہ خاندانی نظام کو گھرانے کی شان سمجھا جاتا تھا۔ جب جدید معاشرت میں حالات اس سے مختلف ہیں۔ افسانہ نگار نے ہمارے سامنے اس نظامِ معاشرت کو پسنے بسانے کے لیے نقصان دہ قرار دیا ہے۔ افسانہ "جنتِ گم گشتہ" مشترکہ خاندانی نظام کی وجہ سے گھروں میں بگاڑ اور اُجاڑ کی صورتحال کو اجاگر کر رہا ہے۔ بدلتے زمانے میں معاشرے کا اندازِ فکر بدلا ہے اور نئی نسل نے مغرب کے زیر اثر اپنی معاشرت قائم کی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے افسانہ "اُلٹی قمیض" بھی اسی مشترکہ نظام خاندانی کی عکاسی کی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ معاشرے کے لوگوں کے متعلق بھی افسانہ نگار بتاتا ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام کی طرح پرانی معاشرتی روایات اور اقدار کو ختم کیا جا رہا ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو نئے زمانے کی نئی اقدار سکھا رہے ہیں۔

''ایک عرصے سے گھروں میں مادری زبان میں بے تکان بولنے والے، مشترکہ خاندانوں سے نجات پائے یہ لوگ اب بچوں سے ٹھہر ٹھہر کر اُردو میں بات چیت کرنے اور انہیں اچھے سے اچھے انگریزی میڈیم سکولوں میں داخل کروانے کے خواں ہیں۔ اپنی مادری زبان میں اظہار کا خدشہ ان کے دلوں میں گھر کر گیا ہے۔ سو طے یہی کیا گیا ہے کہ بزرگ بھی بچوں کے سامنے آپس میں اُردو ہی میں گفتگو کریں گے کیونکہ

یہی وہ عمر ہوتی ہے جس میں بچے کچھ بھی بہت جلد سیکھ لیتے ہیں۔ ڈرائنگ رومز میں آئے مہمانوں کو انگریزی نظمیں سناتے، معمول کے استعمال کی سبھی اشیاء کے انگریزی نام بتانے والے یہ بچے ان نو آبادکاروں کا سرمایۂ افتخار ہیں۔"[٦]

ملتانی معاشرت میں اعلیٰ طبقے کے گھروں میں ہر کام کے لیے الگ کمرے مختص کیے ہوتے ہیں۔ سونے کے لیے بیڈ روم، کھانے کے لیے ڈائننگ روم، ٹی وی دیکھنے کے لیے لاؤنج، مہمانوں کے لیے گیسٹ روم، پڑھائی کے لیے سٹڈی روم اور کاٹھ کباڑ کے لیے سٹور وغیرہ۔ اگر ہم ملتانی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم معاشرت میں ایسا بالکل نہ تھا۔ گھر میں موجود ہر کمرہ بیک وقت تمام ضروریات کو پورا کرتا تھا۔ ایک کمرہ ایک شخص کے لیے زیادہ سمجھا جاتا تھا اور بیک وقت چار سے پانچ افراد کو سمونے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ تبھی قدیم معاشرت میں گھر کے افراد کے درمیان بھی پیار، محبت، احساسِ انسانیت، رشتوں کے احساس کا جذبہ خالص اور بناوٹ سے پاک تھا۔ آپس میں منافقت اور تکبرانہ جذبات یا پھر احساس کمتری و برتری کے جذبات نہ تھے۔ مگر انگریزوں نے اس خطے میں آ کر یہاں کی معاشرت میں الگ کمروں کے رواج کو قائم کیا۔ جو اب ہمارے معاشرے میں اس قدر پروان چڑھ چکا ہے کہ ہر طبقہ اس کی پیروی کرنے کی کوشش کرنے میں لگا ہے۔ ایک ہی گھر میں رہ کر افرادِ خانہ الگ الگ کمروں میں مقید ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کے درمیان دیواریں نہ صرف گھروں بلکہ وقت کے ساتھ مختلف معاملات کی وجہ سے دلوں میں بھی قائم ہونے لگی ہیں۔ اس چیز کو افسانہ "اولڈ ہاؤس" میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ متکلم بوڑھے باپ کی صورت میں افسانے میں موجود ہے اور بیٹے کے بڑے بنگلہ نما گھر میں مقیم ہے۔ جہاں اُس کا رہنا بہو کو کھٹکتا ہے۔ اپنی سوچوں میں بیٹے کے گھر اور اپنے پرانے مکان کا تقابل کچھ یوں کرتا ہے:

" بڑے گیٹ سے عقبی دروازے تک ہر ہر حصہ اب الگ شناخت کا حامل تھا۔ ڈرائنگ روم، بیڈ روم، ٹی وی لاؤنج، سٹڈی روم، سٹور اور اب...... گیسٹ روم بھی!

ذہن کو بھٹکنے سے کون روک سکتا ہے!

کھلی چھت پر سردیوں کی دھوپ تاپتا میں پرانے مکان میں جا پہنچا کہ جہاں کا ہر کمرہ بیک وقت یہ تمام ضروریات پوری کر سکتا تھا۔

چارپائیوں کی گھٹتی بڑھتی تعداد از خود مکینوں کا شمار کر دیا کرتی تھی۔ ڈرائنگ روم، بیڈ روم، سٹڈی روم اور ٹی وی لاؤنج کی شناختی علامتوں کے بغیر ہی کوئی سا کمرہ کسی بھی ضرورت میں کام آ سکتا تھا۔ ایک کمرہ ایک شخص کے لیے بھی کافی تھا اور بیک وقت پانچ افراد کو سمونے کی وسعت بھی رکھتا تھا۔ اور اب...... ایک کنال کی اس کوٹھی میں رہنے والے چار افراد کے پاس پانچویں کے لئے جگہ نہ تھی!"[٧]

معاشرے کے مختلف افراد کی طرزِ زندگی کا بیاں لیاقت علی کے افسانوں میں جانجا دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ "دو شرطیں"، "مکوڑے"، "نیون سائنز" اور "پلیٹ فارم" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ افسانے عصرِ حاضر کی معاشرت اور مقامی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔

لیاقت علی نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے منافق، ریاکار اور بے حس رویوں کو اجاگر کیا ہے۔ ان رویوں کا ہمارا نہ صرف عادی ہو چکا ہے بلکہ خاندانی روایات اور معاشرتی اقدار کو ختم کر رکھ دیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ مغرب کی بے جا اور بے سمت تقلید ہے کہ جس میں اچھی اور اعلیٰ اقدار کو اپنانا تو دور البتہ بری چیزوں کو اپنی شناخت کا حصہ ضرور بنا لیا ہے۔ "اولڈ ہاؤس" اس حوالے سے لیاقت علی کا بہترین افسانہ ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ریٹائرڈ پروفیسر کبیر اے خان ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام پر مشتمل گھرانے کو اس کہانی میں عکس بند کیا گیا ہے۔ ابتداء میں تمام خاندان میں بڑے میاں صاحب کے حکم چلتے رہے مگر وقت کے ساتھ گھر کی حاکمیت بہو کے پاس چلی گئی۔ بہو نے پہلے پہل بوڑھے سسر کو فالتو سامان کے ساتھ گھر کی بالائی منزل پہ موجود برساتی میں منتقل کر دیا۔ اس کے بعد گھر کے بچوں کے رشتے اور شادی کے لیے آنے والے لوگوں کے سامنے سماجی رشتوں کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بوڑھے سسر کو بھی دعوتوں کے دیگر آرائشی سامان کی طرح سجایا جانے لگا۔ پھر ایک دن خود وقت دینے کے بجائے بیٹے اور بہو نے بوڑھے باپ، سسر کی تنہائی کا یہ حل نکالا کہ اسے شہر کے اچھے ویلفیئر اولڈ ہاؤس میں منتقل کر دیا جائے۔

"شہر میں کسی ویلفیئر سوسائٹی نے ایک اولڈ ہاؤس قائم کیا ہے کہ جہاں بوڑھے کسی محرومی یا احساسِ تنہائی کا شکار نہیں رہتے۔

"اور پھر یہ اولڈ ہاؤس کوئی یتیم خانہ، لاوارثوں کا دارالامان یا اس ٹائپ کی کوئی جگہ تھوڑا ہی ہے! یہ تو بزرگوں کی ضروریات اور مسائل کا وہ حل ہے کہ اب وہ دن دور نہیں جب بڑے بوڑھے یہاں جانے کے لئے سفارش کروایا کریں گے۔"۔

یہ آخری پیش گوئی تو بہو کی زبان سے نکل کر خود میری کمزور سماعتوں تک بھی پہنچی ہے۔"[٨]

اس کے بعد افسانہ "جنت گم گشتہ" ہماری موجودہ معاشرت کے ایسے رویوں پہ مشتمل ہے جو آج کل ہر گھر میں اپنی ماں اور بیوی کے حوالے سے در پیش ہیں۔ لیاقت علی نے معاشرے کے متوسط طبقے کے افراد کی نجی زندگیوں کا مشاہدہ کر کے خوبصورتی سے انہیں کہانیوں میں سمویا ہے تاکہ عوام کے سامنے ایسے رویے اجاگر کر کے انہیں معاشرے سے کتم کرنے کی کوشش کی جائے۔ افسانہ "جنت گم گشتہ" کا مرکزی کردار سمیر ہے۔ جو شادی ہونے کے بعد اپنی الگ سماجی شناخت کے طور پر گھر اور برادری سے ملنے والی وہ رعائتیں جو شادی سے پہلے میسر تھیں، گنوا بیٹھا ہے۔ بے فکری، بے نیازی، لاپرواہی اور ہٹ دھرمی جیسی زندگی گزارنے والے سمیر کو شادی کے بعد رسم و رواج کے تقاضے، رکھ رکھاؤ اور لجاجت جیسے رویوں کو نبھانے کے چکر میں کبھی ماں اور کبھی بیوی کی عدالت میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ گھر والوں کی باتوں اور "رن مرید" جیسے طعنوں سے بچنے کے لیے سمیر بیوی سے ماں کی خدمت کرواتا ہے۔ اور گھر والوں کے سامنے بیوی سے کام کراتا ہے تاکہ ماں خوش اور راضی رہے۔ مگر حمل ہونے اور کام کی زیادتی کی وجہ سے سمیر کی بیوی بستر سے لگ جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے مکمل آرام اور اچھی خوراک تجویز کرتا ہے۔ کہانی میں معاشرے کے رویوں کو انسان کی ازدواجی زندگی میں مداخلت کی عکس بندی یوں کی گئی ہے:

"میں ایک متوسط طبقے کا قلیل آمدنی والا شخص ہوں جس کی تنخواہ بیس ہزار روپے ہے۔ اگرچہ ان بیس ہزار روپے سے میرے اخراجات بمشکل پورے ہوتے تھے، پھر بھی ایک مریض کے لیے ضرورت کے یہ پھل بہر حال مجھی کو خریدنا تھے۔ لیکن میری پریشانی اُس وقت اَماں کے بی۔ پی کی طرح شوٹ کر گئی جب تیسرے روز متواتر جوس کے دو پیکٹ، دو کیلے، دو سنگترے اور ایک سیب شاپر میں بالائی منزل منتقل ہوتے دیکھ کر بھابھی نے سوال اُٹھایا: "ہمارے میاں گھر میں جو لائیں وہ پہلے اَماں کے کمرے میں آئے اور پھر برابر تقسیم ہو اور یہاں محترمہ کے لیے پھلوں کے شاپر بالا ہی بالا اوپر کی منزل کو منتقل ہو جائیں؟"
بھابھی کے اس سوال نے اُس دیا سلائی کا کام کیا جو بظاہر ننھا سا ایک شعلہ اُگلتی ہے مگر بڑی بڑی مضبوط عمارتوں کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتی ہے۔"[۹]

درج بالا افسانے میں افسانہ نگار نے اس بات کو اجاگر کیا ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام جو قدیم معاشرت میں شان کی علامت سمجھا جاتا تھا، اب جدید زمانے میں اس نظام کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں مشکلات در آئی ہیں۔ لوگوں کے حسد کی وجہ سے گھر بسنے کے بجائے اُجڑنے لگے ہیں۔ جدید مقامی معاشرت میں اس نظام کا خاتمہ ضروری ہے۔ دراصل ہمارے معاشرے پر مغرب کی چھاپ کچھ اس طرح سے حاوی ہوئی ہے کہ مقامی آدمی نے معاشرتی اقدار کے ساتھ اسلامی آداب اور نیاز مندی کو بھی بھلا دیا ہے۔ آزاد خیالی اس طرح سے پروان چڑھی ہے کہ ہم مذہبی لحاظ سے واجب احترام کو بھی بھول گئے ہیں۔ معاشرے کے ایسے رویوں کی مثال افسانہ "پرچھائیاں" میں یوں بیان ہوئی ہے:

"شام تقریب میں جب کہانی سنا رہا تھا عین اُسی وقت اذان شروع ہو گئی۔ میں احتراماً خاموش ہو گیا۔ حاضرین میں سے کچھ سے اپنے اپنے موبائل نکالے اور میسج کرنے لگے۔ کچھ سرگوشیوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے غور کیا اذان کی آواز میں ایمبولینس کی آواز بھی ملنے لگی ہے۔ دونوں آوازیں جیسے ایک دوسرے پر حاوی ہو جانا چاہتی ہوں۔ ایسے عالم میں حاضرین میں سے کسی کے موبائل پر ایک دُھن بجنے لگی۔ یوں یہ تیسری آواز بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئی۔ آوازوں میں وقفہ آیا اور کہانی پھر سے شروع ہو گئی۔"[۱۰]

معاشرے کے ان تمام منفی رویوں کے ساتھ افسانہ نگار قاری کے سامنے افسانہ "پلیٹ فارم" کے کردار نیازی صاحب کا رویہ لاتا ہے۔ متکلم کہانی میں "نیازی صاحب" کے بک سٹال پہ سیلز بوائے کے طور پہ کام کرتا ہے۔ نیازی صاحب کا کردار لیاقت علی کے افسانوں میں کردار نگاری کا مثالی کردار ہے۔ معاشرتی رویے کے طور پر اس کردار میں ہم معاشرے کے شفاف، اُجلے کردار اور خودی کا پیکر فرد کا رویہ دیکھتے ہیں جو انسان دوستی، خودداری اور رشتوں کی پاسداری میں اپنی مثال آپ ہے۔ جس میں مشرقی تہذیب کا رچاؤ اور فکری روایات کا پورا عکس نظر آتا ہے۔ ہر دن نئے روپ اور نئے زاویے کے ساتھ نظر آنے والے ایسے کردار ہمارے معاشرے میں معاشرتی روایات و سماجی تعلقات نبھانے کو فرض سمجھتے ہیں۔ کسی دور اندیش، نااہل کو کتابیں نا بیچ کر نقصان برداشت کر لیتا ہے مگر مطلبی اور خود غرض دوستوں سے تعلقات خوب نبھاتا ہے۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3 2024

"میں دیکھ رہا تھا کہ بہت سے دوست احباب تو محض وقت گزارنے یا چائے کا کپ پینے بھی اُن کے پاس آن بیٹھتے تھے۔ مگر وہ تھے کہ گاہکوں کی آمد پر تیوری چڑھ سکتی تھی، دوستوں کے معاملے میں ان کے ماتھے پر کبھی بل نہ آیا۔ ادھر کوئی دوست ان کے پاس آتا اُدھر محسوس ہوتا جیسے اُن میں کسی نے کوئی انجانی توانائی بھر دی ہے۔" [۱۱]

لیاقت علی نے معاشرے کی برائیوں کے حوالے سے رشوت، سفارش، چوری، ڈکیتی کے ساتھ جنسی جبلت، جنسی بے راہ روی اور جنسی تسکین کو موضوع بنایا ہے۔ ہمارے سامنے لیاقت علی کا افسانہ "رول نمبر ۱۰" بیک وقت سفارش، رشوت اور جنسی جبلت جیسی معاشرتی برائیوں کو اجاگر کر رہا ہے۔ افسانے میں مرکزی کردار متکلم، جو یونیورسٹی کے ایک استاد ذیشان صاحب کی صورت میں موجود ہے۔ کہانی کے مطابق لائبریری کا چیف ذکاءاللہ متکلم کے پاس ایک طالبہ کی سفارش لے کر آتا ہے۔ افسانہ نگار نے ہماری توجہ اس معاشرتی برائی کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی ہے جو اب ایک معاشرتی المیہ بن چکا ہے۔ ہماری جامعات کی فضا میں سفارش اور رشوت کا ماحول بن چکا ہے۔ نمبروں کے حوالے سے اساتذہ کے ساتھ لین دین کیے جاتے ہیں اور ایسے ہی سفارشی ڈگریاں لے کر استاد بننے والے افراد ہی اس طرح کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ کہانی کے مطابق ذکاءاللہ سفارشی بن کا جب بھی آتا ہے ساتھ میں رشوت کے طور پہ کبھی پھل، کبھی سوہن حلوہ ضرور لاتا ہے۔ جسے خندہ پیشانی سے آگے قبول بھی کر لیا جاتا ہے۔

"ذکاء صاحب نے دھیرے سے دستک دی اور ایک ہاتھ میں شاپر پکڑے مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس بار شاپر میں پھلوں کے بجائے سوہن حلوے کا ڈبا تھا۔ اس بار انھیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ خالی ہاتھ آتے اچھے نہیں لگتے تھے اور نہ ہی مجھے یہ کہنے کی حاجت کہ اِس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ اُن کا یہ فرض اور میری توقع اَب ایک خاموش سمجھوتے کی صورت اختیار کر گئے تھے سو میں نے ڈبا میز سے اُٹھایا اور الماری میں رکھ دیا۔

"اس بار بھی خیال رکھیے گا، رول نمبر تو یاد رہے گا نا؟"

"جی۔۔۔جی۔۔۔دس۔۔۔دس۔" میں نے دوبار دہرایا۔" [۱۲]

افسانہ نگار نے کڑوے سچ کی طرح معاشرے کی اس حقیقت سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے کہ جامعات کے معلم ہوں یا لائبریرین، ان سفارشات کے پیچھے ان کی اپنی کوئی ذاتی غرض یا جنسی جبلت چھپی ہوتی ہے۔ اچھے نمبروں کا جھانسا دے کر، ایسے سفارش کروا کے جنسی طور پہ طلباء کو ہراساں کیا جاتا ہے۔ جیسا اس کہانی کا اختتام بھی اس حقیقت کا واضح کرتا ہے کہ رول نمبر ۱۰ کے ٹھینگا دکھانے پہ وہی ذکاءاللہ سمسٹرری پیٹ کی سفارش کرتا ہے۔ اس طرح کے معاملات اور حالات ہماری جامعات میں عام ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد افسانہ "قرض" میں افسانہ نگار نے ایک بوڑھے باپ کو جنسی جبلت کی تسکین کا متلاشی دکھایا ہے۔ ایسی صورت میں جنسی کج روی کا شکار باپ کبھی روٹیاں پکاتی دائی کنیز، کبھی گھر میں کام کرتی ملازمہ کو جنسی طور پہ ہراساں کرتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی بچوں سے ریموٹ چھین کر ٹیلی ویژن پہ گندے ننگے چینل دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے دونوں بیٹے اپنی ماں کی مرتے وقت تاکید کی وجہ سے باپ کو کچھ نہیں کہہ پاتے۔

"مجھے تو بہر حال دودھ کی وہ بتیس دھاریں ہر صورت بخشوانا تھیں جو اماں کی آخری سانس تک میرے ذمّے واجب رہیں، اور پھر ماں کی سانسوں کے ساتھ یہ بخشش ختم نہیں ہوئی بلکہ اباجی کی ہر خواہش کے احترام کے ساتھ مشروط ہو گئی۔ اماں نے مرنے سے پہلے بیسوں مرتبہ ہم دونوں کو تاکید کی کہ باپ کو کبھی کوئی تکلیف نہ دینا ورنہ میں اپنا دودھ نہیں بخشوں گی۔" [۱۳]

جنسی کج روی، جنسی جبلت کی تسکین کے حوالے سے معاشرے میں پھیلے جنسی مسائل و برائیوں کو افسانہ "الٹی قمیض" اور "لانگ ویک اینڈ" میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ افسانہ "الٹی قمیض" میں چار کردار ہیں۔ مرکزی کردار متکلم، متکلم کی بیوی جمیلہ، متکلم کا دوست رفیق خاور اور رفیق خاور کی بیوی آصفہ۔ یہ دونوں گھرانے ایک ہی کالونی میں رہتے ہیں اور آپس کے خاندانی اور دوستانہ تعلقات مثالی ہیں۔ دونوں دوستوں کی شادی کو پانچ برس کا عرصہ بیت چکا ہے مگر ابھی تک اولاد سے محروم ہیں۔ متکلم اور رفیق خاور کی بیوی آصفہ کے مابین ناجائز تعلقات قائم ہیں۔ ازدواجی تعلق سے ہٹ کر، معمول کی یکسانیت سے نجات کے لیے اور جنسی کج روی کے خلا کو پورا کرنے کے لیے دونوں اپنے شریک حیات کی غیر موجودگی میں ایک دوسرے کے ساتھ چوری چھپے وقت گزارتے ہیں۔

JAHAN E TAHQEEQ جہانِ تحقیق
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3 2024

"بے پناہ پیار، بے جا توجہ اور ہمہ وقت کی جی حضوری کا اثر یہ ہوا کہ ہمیں یکسانیت نے آن گھیرا۔ اور یہ کون نہیں جانتا کہ اگر معمول بن جائے تو جنت بھی بوجھ محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہمیں سر عام اظہار اور بے پناہ محبت کے بیچ تعلق کی ایسی جہت کی تلاش رہنے لگی جہاں ہماری آزادی سلب نہ ہو۔ ہمارا ہر فعل ذمہ داری اور وفاداری کے احساس سے خالی محض لینے اور دینے تک محدود رہے۔ اور پھر اس لین دین میں بھی کسی فریق کو خسارے کا احتمال نہ ہو۔ سو بہت ہی غیر محسوس طریقے سے آصفہ اور میں نے اپنی اپنی ذات کے اس خلا کو محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے کو جگہ دی کہ وہ آئے اور اسے پُر کر لے۔"[۱۴]

اس کہانی میں متکلم اور آصفہ کے اپنے شریک سفر سے منافقانہ رویے کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ گناہ کی اس دلدل میں دھنسے ہوئے متکلم اپنی بیوی جمیلہ اور رفیق خاور کے متعلق بھی ایسا گماں کر لیتا ہے اور اپنے دل میں بیوی کے لیے شک کا ایسا بیج بو لیتا ہے جس کا حقیقی سبب اپنے خود کے کالے کرتوت ہیں۔ کہانی کا اختتام میں جمیلہ کی پاکدامنی شوہر کی گندی ذہنی حالت کو عیاں کر دیتی ہے۔

افسانہ "لانگ ویک اینڈ" میں بھی مرکزی کردار "احمد مسعود" جنسی تسکین کا جائز وسیلہ بیوی حمیرا کے ہونے کے باوجود بھی جنسی تشنگی کی تسکین کا متقاضی ہے۔ اس پوری کہانی میں افسانہ نگار نے احمد مسعود کو ملتان شہر کے ہر کونے میں گھومتا منظر کشی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دوسری جانب معاشرے کا مقامی عورت کو جنسی حوالے سے ارزاں سمجھنا بھی ایک المیہ ہے۔

"آج کل شہر میں جو جنس سب سے ارزاں بک رہی ہے، وہ عورت ہے۔ بس آپ قلعے کی ایک سڑک پر شاہ رکن عالم کے دربار کے آس پاس کہیں بھی جا کر یونہی دس پندرہ منٹ صرف گاڑی کھڑی کر کے اندر بیٹھ جائیں کوئی نہ کوئی لڑکی از خود آ کر گاڑی میں بیٹھ جائے گی۔"[۱۵]

معاشرے کی عورت کے متعلق ایسی باتوں کی تصدیق تو اس وقت ہو جاتی ہے جب احمد مسعود کو ایک مفلس و نادار بھکارن بھی اپنی مجبوری پہ عزت اور عورت کے رتبے کو اہمیت دیتی ہے۔

"کچھ دیر بعد ایک بھکارن نمودار ہوئی اور شیشے کے ساتھ لگ کر پیر بہاول حق کے صدقے خیرات مانگنے لگی۔۔۔ اچانک اس کا جی چاہا کہ وہ اُس کے بھرے بھرے جسم کو چھو کر محسوس کرے۔ اگر اسے نہلا دھلا کر بہتر کپڑے پہنائے جائیں تو یقیناً یہ پر کشش محسوس ہو گی! اُسے خیال آیا۔

"پیسے لینے ہیں؟ یہاں تو نہیں ہیں۔ گھر چلو جتنے چاہو لے لینا۔"

اُس نے بے قابو ہوتے جسم کی آگ کے سامنے ہتھیار پھینکتے ہوئے اُس خواہش کا اظہار کیا جسے عام زندگی میں وہ شاید کبھی بھی ماننے کے لیے تیار نا ہوتا۔

"لعنت ہو تم پر...... حرامزادے...... سُور کے بچے...... ماں کو لے جاؤ ساتھ!"[۱۶]

سفارش، رشوت اور جنسی برائیوں کے بعد لیاقت علی کے ہاں چوری، ڈکیتی جیسی برائیوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو کہ ملتان کی موجودہ زمانے کی معاشرت میں پھیل چکا ہے۔ خاص طور پر شہروں میں تعمیر کردہ کالونیوں میں اس طرح کے واقعات عام ہوتے جا رہے ہیں بالخصوص گرمیوں کے دنوں میں دوپہر کو گلیوں میں خاموشی اور ہو کا عالم ہوتا ہے ایسے میں گھروں کے دروازے کھٹکا کر ٹھنڈا پانی پینے کے بہانے ڈکیتی کی وارداتیں عام ہوتی جا رہی ہیں۔ معاشرے میں مرزا واحد بخش جیسے کردار کی محتاط نظریں محافظ کا کردار ادا کرتی ہیں۔ افسانہ نگار نے افسانہ "گنبدِ بے در" میں ایسے ہی ایک واقعے کو قلم بند کیا ہے۔

"خالہ حلیمہ کے دروازے پر ایک بوڑھی عورت نے دستک دی۔ خالہ کپڑے دھو رہی تھیں، اندر ہی سے آواز دی:

"کون؟"

"بیٹا پیاس لگی ہے پانی مل جائے گا!" جواب ملا۔ خالہ بغیر کسی تحقیق کے دروازہ کھولتے ہوئے بولیں:

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3 2024

"اماں کیوں نہیں ملے گا۔ کیا کربلا ہے!"

لیجئے! امّاں اکیلے پانی پینے نہیں آئیں اُن کے دو کڑیل بیٹے بھی ساتھ اندر آئے اور پھر خالہ کے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کھولتے ہوئے منہ پر لگی ٹیپ کوئی چار گھنٹے بعد میاں جی نے آ کر اتاری''[۱۷]

لیاقت علی نے اپنے افسانوں میں لوگوں کی معاشی بدحالی اور کسمپرسی کو بھی موضوع بنایا ہے کہ کس طرح پیٹ کی آگ بجھانے اور تلاشِ معاش کے لیے دوسرے شہروں کے دھکے کھاتے ہیں۔ دراصل معاشرے کے لوگوں کا ذہنی اور جسمانی استحصال جبر واستبداد کی قوتوں کی وجہ سے ہے۔ ہماری معاشرت میں موجود ایسی قوتیں کبھی کبھار اپنے ماضی کی مفلسی، غربت اور معاشرتی تذلیل واستحصال کا بدلہ بھی لیتی ہیں جیسے افسانہ "کرم داد بھی" میں ڈاکٹر حیدر کا کردار ہمارے معاشرے کا ایک ایسا کردار ہے جو اپنے بچپن سے گاؤں کے نمبردار کا اپنے باپ سے تذلیل اور ہتک آمیز رویہ دل میں لیے ہے اور نمبردار سے بھی اونچا افسر بن کر اس طرح کے انسانی استحصال کرنے والے وڈیروں، جاگیرداروں اور حکمرانوں سے نبرد آزما ہونا چاہتا ہے۔ یہی سوچ پروان چڑھتے ہوئے حیدر کو پڑھ لکھ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے انسانی حقوق اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کی طرف راغب کرتی ہے۔ مگر اعلیٰ عہدہ ملتے ہی سرکاری گاڑی کی شان اور رتبے کے ٹھاٹھ اس کی انسانی استحصال کے خلاف پُرجوش لفظوں اور بامعنی نعروں پر مبنی سوچ کو بند کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر حیدر عام آدمی کو بے صبرا اور جذباتی سمجھنے لگتا ہے۔

''مسز حیدر کو افسوس تھا کہ وہ شخص جس نے تمام عمر انسانی استحصال کے خلاف آواز اُٹھائی، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور آمروں کے خلاف سچ بولنا سیکھایا اور بعض اوقات اپنے شاگردوں میں مشکوک کر دینے والی محبت بانٹی، آج Do not disturb کی تختی لگائے، بالواسطہ فون، سیاہ شیشوں کی بند گاڑی، پرہیزی کھانے اور منرل واٹر کا ایسا رسیا ہوا کہ اپنے سبھی آدرش بھول گیا۔''[۱۸]

یہ ہمارے معاشرے کا بدترین المیہ ہے کہ کمزور اور کمتر طبقے کے افراد اپنے ساتھ ہونے والے استحصال کی وجہ سے وڈیروں، جاگیرداروں اور اعلیٰ طبقے کے افراد کے جیسا بننے کے خواب دیکھتے ہیں تاکہ اپنے لوگوں کے لیے خیر وبھلائی کے کام کر سکیں مگر معاشرے میں اعلیٰ مقام ورتبہ ملتے ہی زندگی کی آسائشوں میں کھو کر سب بھول جاتے ہیں۔ ڈاکٹر حیدر بھی لیاقت علی کا تراشا ہوا ایسا ہی ایک کردار ہے۔

لیاقت علی نے دراصل اپنے لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ باریک بینی سے کیا ہے اور ان کی مفلس، بے بس اور نادار زندگی کو بدل دینا چاہتا ہے مگر سوچوں اور رویوں کو بدلنا اتنا آسان نہیں ہے معاشرے اس وقت بدلتے ہیں جب مقامی لوگوں کا اندازِ فکر بدلتا ہے۔

اسی طرح معاشرے میں بسے غریب، تنگ دست لوگوں کی عکس بندی افسانہ " ٹیکسی اسٹینڈ" میں بھی کی گئی ہے جو روزگار کے لیے کس قدر جتن کرتے ہیں اور محدود وسائل میں ضروریات زندگی پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں دہاڑی پہ کام کرنے والے اور رکشہ یا ٹیکسی چلانے والوں کے گھر کیسے چلتے ہیں؟ ضروریات کیسے پوری ہوتی ہیں؟ اس کی عکس بندی افسانہ " ٹیکسی اسٹینڈ" میں خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہے:

''دن میں دو چار چھوٹے سفر کی بھولی بھٹکی سواریوں سے گھر کا چولہا جل تو رہا تھا مگر ایک مدت سے شاید ہی کوئی اچھا کھانا اُس نے یا اُس کے بچوں نے کھایا ہو۔ سرکاری اسکول کی کم فیس کے باوجود دو بچوں کے تعلیمی اخراجات، دو چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال اور اس دو کمرے کے مکان کے ماہانہ کرایے کو یہ دو چار سواریاں تھوڑا ہی پورا کر سکتی تھیں؟ اور اگر کہیں بیماری گھر کا راستہ دیکھ لیتی تو اُدھار لے کر یا کھینچ تان کر دوا دارو کا حیلہ کرنا پڑتا۔''[۱۹]

اس کے بعد افسانہ نگار ہمارے سامنے سکول، کالج، یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے اُن غریب طلبا کو لاتا ہے کہ جو اچھے مستقبل کے لیے تعلیم کو کسی طور جاری رکھے ہوتے ہیں۔ سرکاری اداروں میں پڑھ کر بھاری فیس کے بوجھ سے تو بچ جاتے ہیں مگر جامعات میں معاشرے کے حساب سے چلتی اعلیٰ اقدار کی روش کے ساتھ چلنا ان غریب، مفلس طلبا کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ایسے طلبا کو تعلیمی اداروں میں تعلیم کے ساتھ اپنی مفلسی کو بھی چھپانا پڑتا ہے۔ افسانہ "ہم زاد" میں طلبا کی ایسی صورتحال کو کچھ اس طرح سے قلم بند کیا گیا ہے:

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3 2024

''رمضان کریانے والے کالاغر سابیٹااور اُس کا کلاس فیلو شکیل کہ جس کے متعلق مشہور تھا کہ اُسے سردی نہیں لگتی۔ وہ سردیوں کی یخ بستہ صبحوں میں کالج آتا تواس دعوے کی تصدیق اُس کا باریک کپڑے کا ڈھیلاڈھالا لباس کرتا جس پر اُسے کسی جرسی یا جیکٹ کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ سب اُسے اپنے دعوے سمیت قبول کر چکے تھے مگر ایک وہ تھا جو یہ ماننے پر آمادہ نہیں تھا کہ شکیل کو کالج میں ہی سردی کیوں نہیں لگتی۔۔۔؟ پھر یہ عقدہ حل کرنے میں اُسے زیادہ دیر نہ لگی کہ لنڈے کی وہ سویٹریں جو شکیل رات سوتے میں بھی اُتارنا نہیں بھولتا، اُنھیں کالج پہن کر آنے کے لیے جس حوصلے کی ضرورت تھی وہ اُس میں نہ تھا۔''[۲۰]

لیاقت علی نے علامتی افسانے لکھنے سے گریز کیا ہے۔اس کی وجہ ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ علامت نگاری سے قاری کی تفہیم مشکل ہوتی ہے ایسے میں افسانہ نگار جو بات عوام تک پہنچانے کے لیے کہانی لکھتا ہے وہ قارئین تک بآسانی نہیں پہنچتی۔ تبھی لیاقت علی نے اپنے افسانوں میں بیانیہ انداز کو ابلاغ کا ذریعہ بنایا ہے۔ سماجی اور معاشرتی حوالے سے شعور کی پختگی کا اظہار واضح طور پر افسانوں میں موجود ہے۔ موضوع، کردار اور کہانی کی مدد سے معاشرے کے حقائق کھل کر قلم بند کیے گئے ہیں۔ کہانیوں میں مقامی زندگی اور ماحول کے نقش مقامی معاشرت کے بیاں کا واضح اظہار ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر روبینہ ترین بھی لکھتی ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ لیاقت علی اس خطے کے نوجوان تخلیق کاروں میں وہ واحد شخص ہے جس نے ملتان کی تہذیب و معاشرت اور اس شہر کے مرقعے اپنی کہانیوں میں بڑے واضح انداز میں سموئے ہیں۔ شہر کی روزمرہ زندگی کی متحرک تصویریں بڑی تعداد میں لیاقت علی کی کہانیوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔''[۲۱]

حوالہ جات

۱۔ لیاقت علی، "جھوٹے آدمی کے اعترافات"، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۸ء، ص ۸،۷

۲۔ محمد حمید شاہد، "سچے آدمی کا فکشن" مشمولہ "جھوٹے آدمی کے اعترافات"، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۸ء، ص ۱۴

۳۔ لیاقت علی، "شناخت" مشمولہ "جھوٹے آدمی کے اعترافات"، ص ۲۴

۴۔ لیاقت علی، "قرض" مشمولہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں"، ضوریز پبلی کیشنز، ملتان، جون ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۰

۵۔ لیاقت علی، "لانگ ویک اینڈ" مشمولہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں"، ص ۱۲۶

۶۔ لیاقت علی، "اُلٹی قمیض" مشمولہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں"، ص ۷۶

۷۔ لیاقت علی، "اولڈ ہاؤس" مشمولہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں"، ص ۳۴

۸۔ لیاقت علی، "اولڈ ہاؤس" مشمولہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں"، ص ۳۹

۹۔ لیاقت علی، "جنت گم گشتہ" مشمولہ "جھوٹے آدمی کے اعترافات"، ص ۸۱،۸۰

۱۰۔ لیاقت علی، "پرچھائیاں" مشمولہ "جھوٹے آدمی کے اعترافات"، ص ۵۲

۱۱۔ لیاقت علی، "پلیٹ فارم" مشمولہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں"، ص ۶۱

۱۲۔ لیاقت علی، "رول نمبر ۱۰" مشمولہ "جھوٹے آدمی کے اعترافات"، ص ۹۸

۱۳۔ لیاقت علی، "قرض" مشمولہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں"، ص ۱۰۲

۱۴۔ لیاقت علی، "اُلٹی قمیض" مشمولہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں"، ص ۷۸

۱۵۔ لیاقت علی، "لانگ ویک اینڈ" مشمولہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں"، ص ۱۲۷

۱۶۔ لیاقت علی، "لانگ ویک اینڈ" مشمولہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں"، ص ۱۲۸

۱۷۔ لیاقت علی، "گنبدِ بے در" مشمولہ "جھوٹے آدمی کے اعترافات"، ص ۱۵۱، ۱۵۲

۱۸۔ لیاقت علی، "کرم داد بھی" مشمولہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں"، ص ۱۱۱

۱۹۔ لیاقت علی، "ٹیکسی اسٹینڈ" مشمولہ "پلیٹ فارم اور دوسری کہانیاں"، ص ۱۶۱

۲۰۔ لیاقت علی، "ہم زاد" مشمولہ "جھوٹے آدمی کے اعترافات"، ص ۱۷۰

۲۱۔ روبینہ ترین، ڈاکٹر، "تاریخ ادبیاتِ ملتان"، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۳۲۴